ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ- روحانی شخصیت اور نظریات

از: مولانا اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منور واشریف

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ اسلامی تاریخ کی ایک ناقابل فراموش شخصیت کا نام ہے،شہرت وعظمت کی انتہاؤں تک پہنچنے کے باوجود اعلیٰ اسلامی اقدار کے حامل،علم وفن کی گہرائیوں کے ساتھ بلندی ذات سے متصف،تعمیر عہد کے ساتھ تعمیر شخصیت کا شاندار نمونہ، جدید ترین دنیا میں بود وباش رکھنے کے باوجود اپنی جڑوں سے پوری طرح وابستہ،غفلت وسرمستی کے تمام تر امکانات کے باوجود عرفان ذات سے بے خبر نہیں، وہ بجا طور پر اس دور میں بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی تمثیل تھے،فرحمہم اللہ۔

انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں،تعلیم وتربیت کے جو مواقع ان کو ہاتھ آئے، خدمت وسرگرمی کا جو میدان ان کو ملا،ساری دنیا میں انھیں جانے کا جس طرح موقعہ ملا اور روئے زمین کی طنابیں ان کے لیے سمیٹ دی گئیں،جدیدیت کی دنیا میں صحرانوردی کی اور عمر کا بڑا حصہ مادیت کے سمندروں کی سیاحی میں گذرا،ان سب کے باوجود اپنی ذات کے لیے انھوں نے جو روش اختیار کی،اور رنگ ونور سے آباد دنیا میں جس طرح انھوں نے تنہا زندگی گذاری، وہ متقدمین صوفیاء اور اہل اللہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔

حصولیابیاں:

❁ ڈاکٹر صاحب مرحوم ایک انتہائی روحانی اور صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے، جہاں جدیدیت کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اہل مغرب سے اس قدر بعد تھا کہ ان کی طرف سے آئی ہوئی ہر چیز سے نفرت کی جاتی تھی، انگریزی تعلیم زہر ہلاہل مانی جاتی تھی، اسکولوں اور کالجوں کو اسلامی تہذیب کا مدفن تصور کیا جاتا تھا؛ چنانچہ خاندانی روایات کے مطابق ڈاکٹر صاحبؒ کو جامعہ نظامیہ

میں داخل کیا گیا، جہاں ۱۹۲۴ء میں امتیازی نمبرات سے انھوں نے کامل کا امتحان پاس کیا۔

❁ اسی دوران گھر والوں کی نگاہ سے بچ کر میٹرک کی تیاری کی اور اس کے امتحان میں شریک ہوئے، اللہ کی شان نتیجہ شاندار آیا، والد مرحوم کو مقامی اخبارات کے ذریعہ اس کی اطلاع ملی، ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھریلو ماحول کی بنا پر سخت مزاحمت کا اندیشہ تھا، والد صاحب کچھ سخت گیر واقع ہوئے تھے؛ لیکن غالباً بیٹے کی شاندار کامیابی کا اثر تھا یا اور کوئی بات، وہ بالکل ناراض نہیں ہوئے؛ بلکہ انھوں نے بیٹے کے حوصلے کی ستائش کی۔

❁ اس سے ڈاکٹر صاحبؒ کی ہمت کھلی اور جامعہ نظامیہ سے فراغت کے بعد اسی سال جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوگئے، وہاں سے بی اے، ایل ایل بی اور ایم اے کے امتحانات فرسٹ کلاس سے پاس کیے۔

❁ پھر قانون بین الممالک پر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔

❁ اس کے بعد فرانس کی مشہور سوربون یونیورسٹی سے ڈی لٹ کیا۔

❁ ۱۹۳۳ء میں جرمن کی بون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر وہیں اردو اور عربی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

❁ ۱۹۳۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کے استاذ بنائے گئے۔

❁ ۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ میں ریاست حیدرآباد کے نمائندہ مقرر ہوئے۔

❁ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے بعد پیرس میں جلاوطنی کی زندگی اختیار کی، وہ سقوط حیدرآباد کو بہت بڑا قومی سانحہ قرار دیتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے ریاست حیدرآباد کے تحفظ اور عالمی برادری میں اس کی نمائندگی کی غرض سے ''حیدرآباد لیبریشن سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی۔

❁ ۱۹۵۰ء میں انھیں پاکستان کا پہلا مسودۂ قانون بنانے کی دعوت دی گئی۔

❁ ۱۹۸۵ء میں ان کو پاکستان کا اعلیٰ ترین سویلین ایوارڈ ہلال امتیاز سے نوازا گیا جو پچیس ہزار (=/25000) امریکی ڈالر کے گرانقدر عطیہ پر مشتمل تھا۔

❁ بعض ذرائع (انٹرنیٹ) کے مطابق ان کو شاہ فیصل ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا؛ لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

❁ انھوں نے فرانسیسی، جرمن، انگریزی، عربی، ترکی، فارسی اور اردو سات زبانوں میں ایک سو (۱۰۰) سے زائد کتابیں اور ایک ہزار (۱۰۰۰) سے زیادہ مقالات ومضامین لکھے۔

❁ قرآن کریم کا فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ کیا، جو کسی یورپی زبان میں سب سے زیادہ چھپنے والے تراجم میں ہے،ملینوں کی تعداد میں ان کا فرنچ ترجمہ قرآن شائع ہوا۔

❁ ان کی کتاب ''تعارف اسلام'' (Introduction of Islam) دنیا کی انتہائی مقبول کتابوں میں ہے۔

❁ انھوں نے دنیا کے بہت سے ملکوں کا سفر کیا، دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے ان کو محاضرات اور لیکچرز کی دعوت دی۔

❁ حکومتوں نے ان کو مہمان بنایا۔

❁ دنیا کے خوبصورت ترین شہر پیرس میں اقامت اختیار کی۔

❁ سیکڑوں لوگوں کو ان کی تعلیمات اور حسنِ اخلاق سے ایمان کی نعمت ملی... وغیرہ، فَرَحِمَهُمُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً.

فقروبے نیازی کی جھلکیاں:

یہ وہ امتیازات ہیں جن میں سے اگر کوئی ایک یا چند کسی شخص کو حاصل ہوجائیں،تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جائے اور اس کا ہضم کرنا اس کے لیے دشوار ہوجائے؛لیکن یہاں یہ حال کہ:

❁ سمندر پی کے بھی خاموش ہیں اور سات طبق آستین میں لیے بیٹھے ہیں اور کوئی نمائش نہیں۔

❁ بلا کی سادگی، عجز وانکسار سے سرخمیدہ، ایثار وفنا کا مجسمہ، ہر ایک کے لیے چشم وابرو بچھائے ہوئے، کچھ نہ ہونے کا احساس ہر وقت حاوی۔

❁ وسائل وامکانات کی فراوانی کے باوجود بے سروسامانی، پیرس جیسے حسین اور جدید ترین شہر میں ایک پرانی عمارت کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں تنہا زندگی گذاری، جس میں کتابوں کے علاوہ نہ کوئی رفیق اور نہ رفیقۂ حیات۔

❁ ان کا فرانسیسی ترجمہ قرآن لاکھوں کی تعداد میں چھپا، اس کے چھاپنے والے کیا سے کیا بن گئے؛مگر رائلٹی کے نام پر ایک فرینک بھی آپ نے قبول نہیں کیا۔

❁ ۱۹۸۷ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ہلال امتیاز کا ایوارڈ پیش کیا گیا؛مگر وہ پوری رقم وہیں بیٹھے بیٹھے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کو عطیہ فرمادی۔

❁ ان کی وفات پر ترکی کے ایک صاحب قلم نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا جو مجھے

انٹرنیٹ پر ملا۔

’’کہ ۱۹۸۳ء میں مجھے پیرس جانے کا اتفاق ہوا، میرا قیام ایک ہوٹل میں تھا، ڈاکٹر صاحب کا پتہ میرے پاس تھا، میں معلوم کرکے وہاں پہنچ گیا، ۱۸۰ سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد ایک پرانی عمارت کی چوتھی منزل پر ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ کے گیٹ پر پہنچا، وہ اپارٹمنٹ میں اکیلے رہتے تھے، دروازہ پر دست دی، اندر سے کوئی جواب نہیں آیا، تھوڑے انتظار کے بعد دوبارہ دستک دی؛ لیکن خاموشی چھائی رہی، میں دروازے پر ایک تعارفی پرچی لکھ کر چھوڑ آیا، پھر لمبے سیر و تفریح کے بعد واپس اپنے ہوٹل پہنچا تو دروازے پر ایک نوٹ منسلک دیکھا، یہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا نوٹ تھا انھوں نے لکھا تھا:

’’میں معافی چاہتا ہوں، آپ نے یاد کیا، اور میرے گھر آئے، میں اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھا؛ لیکن میری سماعت اچھی نہیں ہے؛ اس لیے آپ کی آواز نہ سن سکا، براہ کرم میری معذرت قبول فرمائیں۔‘‘

یعنی ایک نو وارد اجنبی سے جس سے کبھی کی شناسائی نہیں، معذرت کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب خود ان کے ہوٹل گئے، تواضع وانکسار اور دوسروں کی عزت نفس کی رعایت کی شاندار مثال۔

مضمون نگار لکھتا ہے کہ ان کی تواضع وخاکساری، اور بلند اسلامی اخلاق دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا، میں پرچی دیکھتے ہی الٹے قدموں ڈاکٹر صاحب کے پاس واپس پہنچا، ملاقات پر ان کے اسلامی افکار وخیالات اور علوم وحقائق کے بحر بیکراں کی موجوں کا سامنا کیا تو لگا کہ اپنی زندگی کے تمام لمحات نچوڑ کر ان کے قدموں میں رکھ دوں، اس مینارۂ نور کے سایے سے اٹھا تو ساری دنیا اندھیری معلوم ہوتی تھی (www.dr.h..com)

روحانیت کا عملی نمونہ:

اگر روحانیت روح کی بالیدگی، تصوف صفائے قلب اور تقویٰ کانٹوں بھری دنیا میں دامن بچا کر گذر جانے کا نام ہے تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اس کی بہترین مثال تھی، ان کی پوری زندگی اپنے تمام معاملات میں اسی محور کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے، ان کی شخصیت خود روحانی بالیدگی کی علامت اور صوفیانہ کمالات کی معراج تھی، ان کی روحانیت کے ثبوت کے لیے نہ کسی خاندانی پس منظر کی ضرورت ہے اور نہ شجرۂ طریق کی، ایسا عالم ربانی جو صدیوں میں کبھی خال خال ہی پیدا ہوتا ہے، جس کی پوری زندگی شریعت کے مکمل حصار میں بند ہو، جس کی ساری توانائیاں قرآن

وحدیث اور قانون اسلامی کی گتھیاں سلجھانے اور بین الاقوامی علمی معیار پر ان کی نمائندگی کرتے ہوئے صرف ہوئی ہوں، جس نے اپنی تمام صلاحیتوں کا اپنی ذات کے نہیں؛ بلکہ دین اسلام کے لیے خرچ کیں، جس کے پاس اپنے لیے کچھ بھی نہیں تھا، جو غم کل جہان رکھتا تھا؛ لیکن اس کا غم بانٹنے والا کوئی نہ تھا، جس نے اپنے لیے ایک تنکا جمع نہیں کیا؛ لیکن قوم وملت کو علم وفن کی دولت جاوداں دے گیا، جس نے آسمانی ستاروں کی گذرگاہیں دریافت نہیں کیں؛ لیکن علم وفن کے سیاروں پہ کمندیں ڈالیں، جس کے بن موسے ایمان کی خوشبو پھوٹتی تھی، اور جس کا سراپا اسلامی اخلاق کا آئینہ دار تھا، اس کے لیے نہ شجرۂ طریق پوچھنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ معلوم کرنے کی کہ ان کا سلسلۂ بیعت کہاں تک پہنچتا ہے؟

تقویٰ کی حقیقت:

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا:

أَمَا سَلَكْتَ طَرِيقاً ذَا شَوْكٍ؟ قَالَ بَلىٰ قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ؟ قَالَ شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُ، قَالَ فَذٰلِكَ التَّقْوىٰ، (اورده ابن رجب فی شرحه للأربعين للنوويؒ حديث نمبر ۱۸، الزهد الكبير للبيهقیؒ ص۳٦۷، تفسير البغويؒ ٦۰/۱ ط طيبة، تفسير ابن كثيرؒ ٤۱/۱، بلوغ الارب بتقريب كتاب الشعب ٤٦۷/۱)

ترجمہ: امیر المومنین! کیا خاردار راستے سے کبھی آپ گذرے؟ حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں، حضرت ابیؓ نے پوچھا، پھر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا دامن سمیٹ کر پوری احتیاط سے نکلا، حضرت ابیؓ نے کہا بس یہی تقویٰ ہے۔ (بعض روایات میں سائل ومسئول کے نام مختلف ہیں)

ڈاکٹر صاحبؒ نے جدید ترین دنیا میں رہتے ہوئے جیسی مؤمنانہ اور صابرانہ زندگی گذاری، مادیت جدیدہ کی موجوں سے اپنے دامن کو بچایا، حرص وہویٰ کے صحرا میں قناعت ودیانت پر استقامت رکھی، اور نئی تہذیب کے بیابان میں پرانے چراغ جلائے، اور پھر اس چراغ سے کتنے چراغ روشن ہوئے، دلوں اور دماغوں کی بھٹیاں گرم ہوئیں، کتنوں کو علم وہنر کی گہرائی ملی اور بہت سی قدیم اسلامی دستاویزات منظر عام پر آئیں، وغیرہ۔ ایک سچے مؤمن کو اس سے بڑھ کر اور کس چیز کی ضرورت ہے؟ اور اس سے مشکل تقویٰ اور کیا ہوسکتا ہے؟

خاندانی پس منظر:

ڈاکٹر صاحبؒ کا خاندانی پس منظر بھی اس ضمن میں بہت مثالی ہے، وہ مشائخ اور علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد ماجد مفتی ابومحمد خلیل اللہؒ مدراس کے ممتاز عالم دین اور بزرگ تھے، وہ مدراس سے حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے، یہاں نظام کے عہد حکومت میں ان کو ریونیوڈپارٹمنٹ کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، انھوں نے حیدرآباد میں پہلا غیرسودی مالیاتی ادارہ قائم کیا، وہ اسلامی افکار کے مشہور اسکالر تھے، غیردینی نظام سے ان کو سخت نفرت تھی، اس دور میں انگریزی تمدن کی جو وبا پھیل رہی تھی اس سے وہ بہت بیزار تھے اور اس کو پوری ملت اسلامیہ کے لیے سنگین خطرہ تصور کرتے تھے، سن وفات ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء ہے۔

دادا مولوی غوث محمد شرف الملک (۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء) عربی زبان وادب اور اسلامیات کے بڑے عالم ومصنف تھے، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ۳۰ سے زیادہ کتابیں انھوں نے تصنیف کیں، ان کا اہم ترین کام تفسیر قرآن ''نثر المرجان فی رسم نظم القرآن'' سات جلدوں میں ہے۔

نانا مرحوم قاری محمد صبغۃ اللہؒ (۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء) بھی بڑے عالم ومصنف تھے، قرآن کی ایک تفسیر لکھی، مدراس کے حکمراں غلام غوث خاں (۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء) کے عہد حکومت میں چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز رہے۔

جداعلیٰ حضرت شیخ مہائمیؒ:

یہ سلسلۃ الذہب مشہور صوفی بزرگ شیخ مخدوم صوفی ابوالحسن علی بن احمد بن ابراہیم بن اسماعیل المہائمی الدکنی الہندی الحنفی (۷۷۶-۸۳۵ھ مطابق ۱۳۷۴-۱۴۳۲ء) تک پہنچتا ہے، (امام ابوحنیفہؒ کی تدوین قانون اسلامی، مؤلفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، مقدمہ کتاب از حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ بانی وناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد ص ۷ ط دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد ۲۰۰۴ء) جن کا مزار مبارک ماہم (ممبئی) میں بحرمحیط کے قریب صدیوں سے مرجع عام وخاص ہے، ان کا تعلق جنوبی ہند کے نوائت خاندان سے تھا، طبری کے بقول نوائت عرب کے قبیلہ قریش کی ایک شاخ ہے جو حجاج بن یوسف کے ظلم وتشدد سے عاجز آکر مدینہ منورہ سے ہندوستان منتقل ہوگئی تھی، اور بحرہند کے ساحل پر آباد ہوئی، اس طرح شیخ گویا قرشی النسل ہیں (ابجد العلوم للقنوجیؒ ۳/۲۱۹ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۷۸ء، نزہۃ الخواطر ۳/۱۰۵، معجم المطبوعات ۱۷۱۷، فہرست الکتبخانہ ۲/۸۱، الاعلام للزرکلی ۴/۷۵۲، ۷/۱۹۳)

شیخ اپنے وقت کے بڑے محقق عالم تھے،ان کومختلف علوم وفنون پرقدرت تھی ،کئی اہم کتابیں ان کی طرف منسوب ہیں، جن سے ان کے تبحرعلمی کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً تبصیر الرحمن وتیسیر المنان ببعض ما یشیر إلیٰ إعجاز القرآن مطبوعہ دوجلدوں میں (بعض کتابوں میں اس تفسیر کا تذکرہ تفسیر رحمانی کے نام سے کیا گیا ہے) زَوَارِفُ اللَّطائِفِ فی شرح عوارف المعارف، مخطوطہ جلد اول، إراءۃُ الدقائق فی شرح مرآۃِ الحقائق ط الرسالۃ، شرح النصوص لصدر الدین القونوی، أدلۃُ التوحید، خصوصُ النعم فی شرح فُصوصِ الحکم لابن العربیؒ (ابجدالعلوم للقنوجیؒ۳/ ۲۱۹ط دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۷۸ء ،ہدیۃ العارفین۲/ ۳۱۰نسخہ الشاملۃ،معجم المولفین۷/ ۹نسخہ الشاملہ)

شیخ مہائمیؒ فلسفۂ ابن عربیؒ سے متأثر:

شیخ مخدوم مہائمیؒ حضرت محی الدین ابن العربیؒ (ولادت ۵۶۰ھ بہ مقام مرسیہ اندلس- وفات ۲۸ ربیع الثانی ۶۳۸ھ) کے فلسفۂ تصوف سے بہت متأثر؛ بلکہ اس کے بڑے وکیل تھے، اسی لیے حضرت ابن العربیؒ کی مشہوراورمعرکۃ الآراء کتاب فصوص الحکم کی باقاعدہ شرح لکھی۔

ڈاکٹر صاحب کے انکار وحدۃ الوجود کا تجزیہ:

❁ مجھے بڑی حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی مشہور کتاب ''خطبات بھاولپور'' میں معذرت خواہانہ انداز میں نظریۂ وحدۃ الوجود کوقبول کرنے سے انکار کیاہے، ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سلوک اور تصوف کی حقیقت بس یہی تھی بعد کے زمانے میں تصور میں دوسرے تصورات بھی شامل ہونے لگے،وحدۃ الوجوداور وحدۃ الشہود کے مسائل پربحثیں ہونے لگیں، ان چیزوں کونبوی تصوف سے کوئی تعلق اس بنا پرنہیں ہے کہ یہ بحثیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں نہیں پائی جاتیں؛ بلکہ بعد کے لوگوں کی پیدا کردہ ہیں،اسلامی تصوف وہی ہے جس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے اس معجزانہ جملے کے ذریعے فرمائی کہ اللہ کی عبادت یعنی اللہ کے احکام کی تعمیل اس طرح کرو گویا اللہ حاضروناظر ہے، ہمارے اعمال اور ہمارے خیالات، ہرچیز کو دیکھ رہا ہے اگرچہ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔
>
> (خطبات بھاولپورص۱۸۳-۱۸۴ط حافظی بک ڈپو دیوبند)

مگر کسی چیز کا انکار محض اس بنا پر درست نہیں ہوسکتا کہ عہد نبوت میں اس مسئلہ پر کوئی بحث نہیں ہوئی، یا یہ کہ یہ اصطلاح اس زمانے میں موجود نہیں تھی ،اس لیے کہ علوم قرآن وحدیث،فقہ

اسلامی اور عبادات ومعاملات کی بہت سی بحثیں اور اصطلاحات عہد نبوت میں موجود نہیں تھیں اور بعد کے فقہاء ومجتہدین کے یہاں زیر بحث آئیں، مدارج احکام کی بہت سی قسمیں بعد کے مجتہدین نے قیاس واجتہاد کے ذریعہ مقرر کیں، لیکن ان کی شرعی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا گیا، پس کسی نام یا اصطلاح کا بعد از عہد نبوت ہونا برا نہیں ہے، برا یہ ہے کہ اس کی اصل عہد نبوت میں موجود نہ ہو، مسائل واصطلاحات کی نئی نئی شکلیں پیدا ہوتی رہیں گی، اور ہر علم وفن کے مجتہدین اپنے اپنے دور میں نئی صورتوں اور طریقوں کے بارے میں حکم شرعی کا تعین کرتے رہیں گے۔

تصوف وروحانیت بھی دیگر علوم وفنون کی طرح ایک اہم ترین علم ہے اور اس کی ضرورت بھی مسلمانوں کو اسی طرح ہے جس طرح کہ علم القرآن، علم الحدیث اور علم الفقہ کی ہے، اور دیگر تمام اسلامی علوم کی طرح اس کا سرچشمہ بھی قرآن وحدیث اور آثار سلف ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ دیگر علوم کی طرح علم تصوف کے مجتہدین نے بھی کام کیا اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مرتبۂ احسان کے حصول، ذوق عبادت کی آبیاری، تزکیہ اور علاج باطن کے نئے نئے طریقے وضع کیے، جن میں سے ہر ایک کی اصل قرآن وحدیث میں موجود ہے، ان میں سے کسی کو محض اس لیے چیلنج نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اصطلاح نئی ہے۔

مثلاً حدیث میں احسان کی تعریف یہ کی گئی کہ:

أنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فإنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فإنَّهُ يَرَاكَ (صحیح البخاری ج ا ص ۲۷ حدیث نمبر ۵۰ ط دار ابن کثیر الیمامہ بیروت)

ترجمہ: اللہ پاک کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، لیکن اگر اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

اب صوفیاء نے اس حدیث پر محنت کی، اور انسان اپنی عبادات؛ بلکہ جملہ معاملات میں رب العالمین کو اپنی نگاہوں کے سامنے کس طرح مستحضر رکھ سکتا ہے؟ اور خدا کی ہر آن موجودگی کا تصور کیسے قائم ہوسکتا ہے؟ اس کے مختلف طریقے بتائے، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو صاحب شریعت کی منشا پوری نہ ہوتی، نماز روزہ اور جملہ عبادات ومعاملات محض رسم بن کر رہ جاتے، اور خوف خدا، احساس جواب دہی اور خشوع وخضوع کے بے روح الفاظ صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ جاتے، ریاضت ومحنت کے یہ جملہ صوفیانہ طریقے دراصل اسی منزل کے حصول کا ذریعہ ہیں جس کا نام احسان ہے، ان میں عجمی تصورات کا کوئی دخل نہیں ہے۔

وحدۃ الوجود ہو یا وحدۃ الشہود اسی مرتبہ احسان کا آخری مقام ہے، جس میں مؤمن کے قلب ونگاہ پر خدا کی موجودگی کا احساس اس درجہ غالب ہوجاتا ہے کہ ہر شے میں اسے اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے، دنیا کی دوسری تمام چیزیں اس کی نگاہ سے مستور ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ کبھی خود اس کا اپنا وجود بھی مشاہدۂ الٰہی کے انوار میں گم ہوجاتا ہے، ان دونوں مقامات کی بنیاد ہی حدیث احسان کے پہلے جزو "کأنَّكَ تَرَاه" پر ہے، حدیث احسان کے دوسرے جزو (فإنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاه) میں اس سے فروتر درجہ کی نشان دہی کی گئی ہے، جو عام مومنوں کا مقام ہے۔

میں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے انکار وحدۃ الوجود پر اظہار حیرت اس لیے کیا کہ جس حدیث کو انھوں نے وجہ انکار بنایا ہے وہ دراصل اس کے لیے وجہ ثبوت ہے۔

❁ باقی ڈاکٹر صاحب تصوف واحسان کے شہسواروں میں تھے، یہ ان کی خاندانی نعمت تھی اس سے انھیں انکار کیوں کر ہوسکتا تھا، وہ تصور کی اصطلاح سے بھی اتفاق رکھتے ہیں، اور اسلاف نے جو اعمال واشغال تجویز کیے ہیں ان سے بھی ان کو اختلاف نہیں ہے، ہمارے پاس تصوف پر ان کا تیار کردہ کوئی بڑا ذخیرہ نہیں ہے، اور نہ ان کی صوفیانہ زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات ہیں، خطبات بھاولپور میں جو کچھ انھوں نے اظہار خیال فرمایا ہے، اس کی روشنی میں وہ مجھے ایک عالم ربانی اور دیدہ ور صوفی محسوس ہوتے ہیں، وہ عصر حاضر کے ان خشک نگار محققین میں نہیں تھے جن کا دماغ فکر وفن کی بلندیوں پر ہوتا ہے؛ لیکن قلب وروح میں کوئی بانکپن نہیں ہوتی، اور سوز وگداز سے بالکلیہ محروم ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند دونوں کے حامل تھے، ان کے یہاں فکر وفن کی بلندی بھی تھی، اور درد دل کی گرمی اور گہرائی بھی، ان کی ذات علم وتقویٰ کا سنگم تھی، وہ مطالعۂ کتاب اور مطالعۂ ذات دونوں کی لذتوں سے آشنا تھے، وہ روحانیت کا مجسمہ اور تصوف کی معنویت کا عملی نمونہ تھے۔

تصوف کے بارے میں ان کے ذہنی رخ کو سمجھنے کے لیے خطبات بھاولپور سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:

حقیقت احسان:

❁ احسان کی حقیقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

''احسان کے لفظی معنی کسی چیز کو حسن عطا کرنا، خوبصورت بنادینا ہے، زندگی کا کوئی کام ہو، اسے سنوارنا اور خوبصورت طریقے سے انجام دینا یہی احسان ہے، جب ہم اس لفظ کو مذہبی اصطلاح

کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ احکام الٰہی کو سچے دل سے قبول کرنا، اور عبادت میں خلوص پیدا کرنا، ہمارے اسلاف نے اس اخلاص فی العمل کو ''سلوک'' اور ''طریقت'' کا نام دیا ہے، سلوک اور طریقت دونوں کے معنی ہیں راستہ چلنا اور اس سے مراد ہے اللہ کی طرف جانے کا راستہ، بعد میں اسی مفہوم کے لیے تصوف کا لفظ استعمال ہونے لگا''۔ (خطبات ص۱۸۲)

ضرورت احسان:

❁ تصوف کی اہمیت وافادیت کیا ہے؟ اور مؤمن کی عملی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر سنیے:

بالفاظ دیگر حضور خداوندی کا تصور انسان اپنے اندر اس طرح لائے کہ اسے اللہ اپنے سامنے محسوس ہو، گویا اللہ اس کے ظاہر و باطن کو دیکھ رہا ہے، اگر ہم اپنے اندر حضور خداوندی کے تصور کو اتنا ترقی دے لیں کہ یہ تصور ہماری پوری شعوری زندگی پر حاوی ہوجائے، تو ظاہر ہے کہ ہمارے لیے یہ قطعاً ناممکن ہوگا کہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی اور اس سے انحراف کریں، آقا سامنے موجود اور نگرانی کررہا ہو تو کون سا غلام یا نوکر آقا کے احکام کی خلاف ورزی کی جرأت کرے گا (خطبات ص۱۸۲-۱۸۳)

صوفیانہ اعمال واشغال:

صوفیانہ اعمال واشغال، تسبیح وتہلیل اور اوراد و وظائف کے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب بہت واضح خیالات رکھتے ہیں، فرماتے ہیں:

''ہم اپنی اصلاح نفس اور اپنی روحانی قوتوں کو ترقی دینے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کرسکتے ہیں، مثلاً نفلی روزے رکھنا، تسبیح پڑھنا، نفل نمازیں پڑھنا وغیرہ وغیرہ ان کا ذکر حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سب لوگوں کو ایک ہی طریقہ نہیں سکھلایا یعنی نوافل کے سلسلے میں کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ بتایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر شخص کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، اس ضمن میں یہ عرض کردوں کہ سعودی عرب کے علماء تسبیح پڑھنے کو بدعت قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ چیز نہیں تھی، ایک حبشی طالب علم جس نے فرانس میں تعلیم پائی تھی اور آج کل جدہ یونیورٹی میں ملازم ہے، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تسبیح پڑھنا جائز ہے؟ میں نے اس بارے میں کبھی تحقیق نہیں کی تھی؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا مجھے دو ہزار مرتبہ روزانہ سونے سے پہلے پڑھنے کی تاکید فرمائی، دو ہزار ایک ایسا ہندسہ ہے جس کا انگلیوں پر شمار کرنا مشکل ہے، حضرت ابوہریرہؓ ذہین آدمی تھے، انھوں

نے ایک ڈوری لی اوراس میں دوہزار گرہیں ڈال دیں،اس کے ذریعے وہ تسبیح پڑھا کرتے تھے،اب چاہے اس تسبیح میں گرہیں ہوں یا اس کے اندر منکے ہوں یا کوئی اور چیز ہو،اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ واقعہ میں نے اس حبشی طالب علم کو بھیجا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ مطمئن ہوگیا،اس کے بعد مجھے ایک اورحدیث ملی جوصحیح بخاری میں ہے،وہ یہ کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک عورت کے پاس سے گذرے،جس نے اپنے سامنے کنکریوں کا ایک ڈھیر رکھ لیا تھا،وہ دُرود پڑھا کرتی تھی،ایک کنکری اٹھاتی اوردُرود پڑھ کر باز وڈال دیتی،اس کے بعد دوسری کنکری اٹھاتی، کنکریوں کا یہ ڈھیر گویا اس کی تسبیح تھی، یہ ایک غیرترقی یافتہ طریقہ ہے؛لیکن مقصود یہی ہے کہ ہم اپنے انجام شدہ کام کی صحیح مقدار بھول نہ جائیں اوراس ذریعے سے معلوم ہوتا رہے کہ کتنا کام ہو چکا ہے اور کتنا کام باقی ہے؟ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو جن چیزوں کی تاکید کرتے تھے ان میں نفل روزے بھی تھے اورنمازیں بھی، دُرود اور وظائف بھی،اورمختلف موقعوں پر پڑھنے کی مختلف دعائیں بھی، ہرصحابی اپنی صلاحیت اورقابلیت کے مطابق مختلف طریقے اختیار کرتا تھا۔ (خطباب ص۱۸۳)

علامہ ابن رجب حنبلیؒ نے اپنی کتاب ''جامع العلوم والحکم'' میں عہدِ صحابہؓ اورعہد تابعینؒ کے بعض ذاکرین وشاغلین کا ذکر کیا ہے جوتسبیح وتہلیل سے خاص شغف رکھتے تھے،اوراوراد کی گنتی کے لیے انگلیوں کے علاوہ تسبیح یا اور دوسرے ذریعہ کا استعمال کرتے تھے،مثلاً:

❁ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ایک دھاگہ تھا جس میں دوہزار گرہیں تھیں اس پر وہ ہرروز سونے سے پہلے دوہزار (۲۰۰۰) کا وظیفہ پورا فرماتے تھے۔(الحلیۃ لابی نعیمؒ ج۱ص۳۸۳)

❁ حضرت خالد بن معدان روزانہ قرآن کے علاوہ ایک ہزار تسبیح پڑھتے تھے، وفات کے بعد نہلانے کے لیے ان کو تخت پرلٹایا گیا تو دیکھا گیا کہ ان کی انگلیاں ہل رہی ہیں گویا وہ تسبیح پڑھ رہے ہوں(الحلیۃ لابی نعیمؒ ج۵ص۲۱۰)

❁ حضرت عمیر بن ہانیؒ روزانہ ایک لاکھ تسبیحات پڑھتے تھے (الحلیۃ لابی نعیمؒ ج۵ص۱۵۷، شعب الایمان للبیہقی ص۷۱۹)

❁ عبدالعزیز بن ابی رواد کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں مکہ میں ایک عورت تھی جوروزانہ بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) تسبیحات کا ورد کرتی تھی، مرنے کے بعد جب قبر کے پاس پہنچی تو اچانک مردوں کے ہاتھ سے اچک کر قبر میں پہنچ گئی۔ (شعب الایمان للبیہقی ص۷۲۰)

جامع العلوم کے محقق ڈاکٹر ماہر یاسین الفحل نے فیض القدیر کے حوالے سے بعض عارفین کا

قول نقل کیا ہے کہ:

❁ وَمِنْ عَلامَاتِ صِحَّةِ الْقَلْبِ أنْ لاَ يَغْتَرَّ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ وَلاَ يَسْأَمَ مِنْ خِدْمَتِهٖ ولا يَأنِسَ بِغَيْرِهٖ (فیض القدیر ج ۱ ص۷-۲)

ترجمہ: قلب کے صحتمند ہونے کی علامت یہ ہے کہ اپنے رب کی یاد سے غافل نہ ہو، اور اس کی خدمت سے نہ تھکے، اور غیر سے دل نہ لگائے۔ (جامع العلوم والحکم لابی الفرج عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب الحنبلی ج ا ص ۴۴۶ ط دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۸ھ)

رہا یہ کہ ڈاکٹر صاحب کا شجرۂ طریق کس سلسلے سے جڑا ہوا ہے، تو اس بارے میں مجھے کوئی واقفیت نہیں، ممکن ہے اپنے خاندانی مشائخ میں سے کسی سے منسلک ہوئے ہوں یا حضرت مولانا گیلانیؒ سے سلسلۂ تلمذ کی بنیاد پر خیال یہ جاتا ہے کہ انھیں سے یا ان کے پیر طریق سے رابطہ قائم کیا ہو، بہرحال ان کی زندگی میں عالمانہ اور صوفیانہ دونوں رنگ بہت نمایاں تھے، اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

❁ ❁ ❁